تصوّرات

اقبالؒ کا تفکّرِ حرّیت

ڈاکٹر محمد ریاض

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تصوّرات

اقبال کا تصوّرِ حریّت

ڈاکٹر محمد ریاض

All rights reserved. 2002-2006

مرورِ زمانہ سے ماحول کے بدلنے کے نتیجے میں نہایت اہم موضوعات طاقِ نسیاں پر رکھ دیے جاتے ہیں یا انہیں قصۂ پارینہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال اقبال کے تصورِ حریت اور غلامی و آزادی کے سلسلے میں ان کے مؤثر موقف کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے نثر و نظم میں جو کچھ لکھا، اس کا معتدبہ حصہ زبان، قلم اور فکر و عمل کی آزادی سے مربوط ہے۔ اسلامی تہذیب و مدنیت کی ایک امتیازی شان ان کے نزدیک حریت سے ہی عبارت ہے۔ اسی تصور کا عالم پرندگان میں مکہر 'شاہین' ہے۔ تصورِ حریت کی رو سے عبد و جر یعنی غلام اور آزاد کے رجحان اور ان کی صلاحیت میں بڑا تفاوت کارفرما ہو جاتا ہے۔ اقبال اپنے مقالوں میں لکھتے رہے کہ دینِ اسلام کا یہ احسان عالمِ انسانی کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کی تعلیمات اور مسلمان زعما کے طرزِ عمل کے نتیجے میں مکتبِ غلامی تدریجاً ختم ہوا اور ان صدیوں میں قائم ہونے والے عالمی ادارے انسان کے بنیادی حقوق کے علمبردار بنے جن میں حقوقِ آزادی مقدم ہیں۔

اقبال نے اپنا بہت سا کلام مستقل مجموعوں میں شامل نہ کیا جو اب مختلف کتابوں میں یکجا ہے۔ ان کے اردو اور فارسی متداول کلیات میں بھی آزادی کا ذکر معمولی نہیں۔ ان کے ابتدائی کلام میں ایک دلچسپ نظم "ایک پرندے کی فریاد" ہے۔ یہ انگریزی ادب سے ماخوذ نظم ہے جس کا ذیلی عنوان "بچوں کے لیے" مرقوم ہے۔ یہ سیاسی آزادی سے محرومی کا ایک نوحہ ہے۔ اس میں سیاسی اسیر و مقیّد شخص "صیاد" سے آزادی طلب کرتا ہے مگر کسی استعمار گر کا دل کہاں پسیجتا ہے ؎

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

برصغیر کے سیاسی استعمار گر انگریزوں سے حصولِ آزادی کے لیے اقبال کا یہ لہجہ تند سے تند تر ہوتا رہا۔ اس کی انتہا ہمیں مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں ملتی ہے۔ اقبال اس مثنوی میں عالمِ انسانی کی جملہ خرابیوں کا منبع یورپ کو بتاتے ہیں۔ وہ ان تاجر اقوام کی منافقت اور ان کی فریب کارانہ روش کی قلعی کھولتے ہیں۔ جیسا کہ حکومتِ آصفیہ دکن کی شائع شدہ خفیہ دستاویزات مظہر ہیں۔ اس مثنوی کی اشاعت پر دولتِ انگلیسی تفتیش کرنے لگی تھی کہ اقبال کا پیری و رنجوری میں لہجہ اس قدر تند و تیز کیوں ہو گیا تھا۔ علامہ مرحوم نے فرمایا تھا ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
گرگے اندر پوستین برّہ
ہر زماں اندر تلاشِ برّہ
دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش
وائی از افرنگ و از کارِ فرنگ
تا کجا در قیدِ زنّارِ فرنگ
زخم ازو، نشتر ازو، سوزن ازو
ما و جوئے خون و امیدِ رفو
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است
بر زبانش خیر و اندر دل شر است
گوہرش تف دار و در لعلش رگ است
مشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است

All rights reserved.

ہوشمندے از خمِ او مے نخورد
ہر کہ خورد او اندر آں میخانہ مرد

اقبال کو غلامی سے یوں بھی نفرت تھی، کیونکہ ان کے نزدیک اسلام اور غلامی امور ہیں۔ "جاوید نامہ" میں ہے ؎

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق
مومن و غدّاری و کفر و نفاق
با پشیزے دین و ملت را فروخت
ہم متاعِ خانہ[۳] و ہم خانہ سوخت

۱۹۰۹ء میں انہوں نے بزبانِ انگریزی ایک مبسوط مقالہ[۴] "Islam as a Moral and Political Ideal" لکھا۔ اس میں وہ انسانوں کے عبد و حر کے گروہوں میں بٹ جانے کا اشارا کرتے ہیں۔ وحیِ الٰہی انسانوں کے آزاد اور تمدن میں ترقی یافتہ بنانے کا اہتمام کرتی رہی مگر اس ترقی و حریت کو دینِ اسلام نے زیادہ عملی کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خلفائے راشدینؓ اور کئی متاخر مسلمان حکمرانوں نے اپنے تعمیری اقدامات کے ذریعے مکتبِ غلامی کو تدریجاً ختم کرنے کا اہتمام کیا۔ قرآن مجید نے غلاموں کے آزاد کرنے کی تحریص کرائی اور بعض گناہوں کا کفارا غلام آزاد کرنا قرار دیا۔

اقبال کا بنیادی تصور "خودی" ابتدا میں "شخصیت" کے نام سے موسوم ہوا۔ علامہ مرحوم نے فرمایا کہ:

"اگر اسلام، عبد و حر کا امتیاز کم کرتے کرتے اسے ختم ہی نہ کر دیتا تو انسانیت کا معتدبہ حصہ "مکمل شخصیت" سے محروم رہتا۔"

متاخر مسلمان حکام کے غلاموں پر اعتماد اور ان کو مساویانہ معاشرتی حقوق دینے کے سلسلے میں اقبال نے امیر امان اللہ خان کے والد امیر عبدالرحمٰن خان افغانی کی سوانحعمری کا حوالہ دیا ہے۔ اس امیر نے اپنے جملہ عسکری اور انتظامی امور غلاموں کے سپرد کر دیے تھے۔ غلامی و حریت دراصل متفاوت ذہنی رویے پیدا کرتے ہیں۔ اس سے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ عبد و حر دو متفاوت مخلوقات ہیں ؎

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پُرسوز و طربناک

آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک[۵]

مثنوی "رموزِ بیخودی" میں اقبال نے اسلامی مدنیت کے تین اہداف و مقاصد بتائے ہیں۔ یہ اصولی مقاصد ہیں:

۱۔ اخوت
۲۔ حریت
۳۔ مساوات

اخوت کے سلسلے میں انہوں نے حضرت بوعبید ثقفیؓ کے طرزِ عمل کی مثال دی ہے جنہوں نے ایک عام مسلمان کے فیصلے کا احترام کیا اور اس کی طرف سے دشمن کی فوج کے ایک سالار جابان کی جان بخشی کے فیصلے کا پورا پاس رکھا۔

مساوات یعنی قانون کی نظر میں برابری۔ یہاں سلطان مراد اوّل عثمانی کی مثال دی گئی، جو حریت سے بھی مربوط ہے۔ سلطان نے ایک مسجد کی تعمیر بلند کی اور بیچارے معمار کی کلائی کٹوا دی۔ معمار نے حاکم شرع کے ہاں دعویٰ کر دیا تو وہاں سے بادشاہ کا بھی وہی ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ صادر ہوا۔ بادشاہ کا ہاتھ کٹنے لگا تو معمار نے از روئے عدل و احسان اسے معاف کر دینے کا اعلان کیا۔

شاعرِ اسلام نتیجۃً فرماتے ہیں ؎

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

یعنی غلام مسلمان، آزاد افراد سے مرتبے میں فروتر نہیں۔ بادشاہ کا خون، معمار کے خون سے زیادہ پُر رنگ نہیں۔ قرآن مجید کے روبرو غلام و آقا، ٹاٹ و ریشمی مسند ایک ہیں۔

حریتِ اسلامیہ کی مثال علامہ اقبال نے حضرت امام حسینؓ کی شہادتِ عظمیٰ سے دی۔ امامؓ موصوف نے حریت کے برقرار رہنے کی خاطر اپنی اور اپنے خانوادے کی جان کا نذرانہ پیش کر دیا مگر اصولِ اسلام سے متصادم کسی امر پر سمجھوتا نہ کیا۔ اقبال تمہیداً اخوت، مساوات اور حریت کو متداول کرنے والے دینِ حق کی حامل امت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

امتے از ما سوا بیگانۂ
بر چراغِ مصطفےٰؐ پروانۂ
مرسلاں و انبیاؑ آبائے او
اکرم او نزدِ حقؑ اتقائے او
کل مومنؑ اخوۃ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ
ہمچو سرو آزاد فرزندانِ او
پختہ از "قالوا بلیٰؑ" پیمانِ او

یہاں تک واضح ہو گیا کہ اقبال حریت کے اس لیے بھی دلدادہ تھے کہ وہ دینِ اسلام کا تقاضا ہے۔ اور اس نعمت سے شخصیت باخودی کا عامل نشوونما پاتا ہے۔ اس دوسرے سیاق میں وہ نظم "خضرِ راہ" میں حریت اور غلامی کی قوتوں کا اس طرح موازنہ کرتے ہیں ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

اقبال کبھی حریت کو براہِ راست دلآویز صورت میں پیش کرتے رہے اور کبھی غلامی کے مکروہ چہرے سے نفرت دلا کر۔

ایک فارسی قطعے میں وہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ قطعے کا مدعا یہ ہے کہ کوئی کتا دوسرے کتے کا غلام بن کر نہیں رہتا تو انسان کو کیا ہوا؟

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد ۹

ان کی ایک فارسی مثنوی "بندگی نامہ" کتاب زبورِ عجم کا جزو ہے۔ بندگی نامہ یعنی غلامی نامہ۔ اس پوری مثنوی میں اقبال نے غلامی کی مذمت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غلام جدت اور ابداع سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے فنونِ لطیفہ جیسے موسیقی، مصوری اور فنِ تعمیر، نقالی اور زندگی سے فرار کے مظہر ہوتے ہیں۔ ان کا مذہب بھی تظاہر، نفاق اور سر بزیری کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

اس مثنوی کی تمہید بڑی رقت بار ہے۔ چاند، خالقِ کائنات سے ملتجی ہے کہ اسے زمین میں احرار و غیور انسان دکھا، ورنہ اس کی چاندنی کو غلاموں پر ضائع نہ فرما۔

اس حصے کے آخری تیسرے بند کے سات اشعار صنعتِ جمع میں ہیں ؎

شورہ بوم از نیش کژدم خار خار
مور او اژدر گز و عقرب شکار
صرصرِ او آتشِ دوزخ نژاد
زورقِ ابلیس را بادِ مراد
آتشے اندر ہوا غلتندہ
شعلۂ در شعلہ پیچیندہ
آتشے از دودِ پیچاں تلخ پوش
آتشے تند رغو در یا خروش
در کنارش مارہا اندر ستیز
مارہا با کفچہ ہائے زہر ریز
شعلہ اش گیرندہ چو کلبِ عقور
ہولناک و زندہ سوز و مردہ نور
در چنیں دشتے بلا صد روزگار
خوشتر از محکومیٔ یک دم شمار

Iqbal Cyber Library
All rights reserved.
© 2002-2006

یعنی:

ایک ایسے خراب مقام کا سوچیں جہاں بچھوؤں کے ڈنک مارنے کے علائم ہوں۔ وہاں کی چیونٹیاں، سانپوں کو ڈسنے اور بچھوؤں کو شکار کرنے والی ہوں۔ وہاں کی لُو میں دوزخ کی آگ کی تاثیر ہو۔ یہ بادِ تند کشتیِ ابلیس کے لیے سازگار ہو۔ وہاں کی پوری فضا میں آگ پھیلی ہوئی ہو۔ شعلے سے شعلہ لپٹا ہوا ہو۔ آگ سیاہ دھوئیں میں گھری ہوئی ہو۔ اس آگ سے بجلی کی کڑک اور طوفانِ بحر کی سی صدائیں برپا ہوں۔ وہاں کے زہریلے پھن والے سانپ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں۔ اس آگ کے شعلے باؤلے کُتوں کی طرح حملہ آور، ہولناک، تباہی انگیز اور نورانیت سے محروم ہوں۔ اس ہوائے مصیبت میں سینکڑوں زمانے گزارنے سے غلامی کا ایک دن بسر کرنا زیادہ مشکل ہے۔

زبورِ عجم کے غزلیاتی حصے شاعر کے لیے باعثِ فخر ہوئے۔ بالِ جبریل میں فرمایا ؎

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

مگر یہی زبورِ عجم، زبورِ رستاخیز بھی ہے۔ اس کے چند مستزادات بے مثل نشید ہائے حریت ہیں۔ حصہ دوئم کے چند نغموں کی طرف یہاں اشارہ کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

ما چشمِ عقاب و دلِ شہباز نداریم
چوں مرغِ سرالذتِ پرواز نداریم
اے مرغِ سراخیز و پریدن دگر آموز

خاور ہمہ مانندِ غبارِ سرِ راہے است
یک نالۂ خاموش و اثر باختہ آہے است
ہر ذرۂ ایں خاک گرہ خوردہ نگاہے است
از ہند و سمرقند و عراق و ہمداں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

میر و سلطاں نرد باز و کعبتینِ شاں دغل
جانِ محکوماں ز تن بر دند و محکوماں بخواب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

اقبال کے زیرِ حوالہ مستزادات، نغماتِ حریت آموز اور جرأت افزا ہونے کے علاوہ عسکری آہنگ کے بھی آئینہ دار ہیں۔ اسی لے کی مدد سے ان کی شاعری جلال اور شکوہ کی آئینہ دار ہوئی ہے

مقابلہ تو زمانے کا خوب کرتا ہوں
اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نے امیرِ جنود
جبینِ بندۂ حق میں نمود ہے جس کی،
اسی جلال سے لبریز ہے ضمیرِ وجود

علامہ اقبال کی شاہکار تصنیف 'جاوید نامہ' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ صوری اور معنوی حریت کے درس کے سلسلے میں اس کتاب کے تین مقامات بالخصوص قابلِ ذکر ہیں:

ایک مقام پر حضرت میر سید علی ہمدانی 'شاہِ ہمدان' (۷۸۶ھ) حصولِ آزادی کی خاطر جان تسلیم کرنے کا پیغام دیتے دکھائی دیتے ہیں:

با تو گویم رمزِ باریک اے پسر!
تن ہمہ خاک است و جاں والا گہر
گر نگہداری بمیرد در بدن
ور بیفشانی فروغِ انجمن
چیست جاں دادن؟ بحق پرداختن
کوہ را با سوزِ جاں بگداختن
جلوہ مستی؟ خویش را دریافتن
در شباں چوں کوکبے برتافتن
خویش را نایافتن نابودن است
یافتن، خود را بخود بخشودن است

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

اس سے پیشتر فلکِ زحل پر دو غدارانِ وطن کو سخت ترین عذاب میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ ایک بنگال کا میر جعفر تھا اور دوسرا میسور کا میر صادق۔ انہوں نے بالترتیب جنگِ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور جنگِ میسور (۱۷۹۹ء) میں نواب سراج الدولہ شہیدؒ اور سلطان فتح علی ٹیپو شہیدؒ سے غداری کی جس کے نتیجے میں ۱۰۰ سال کے عرصے میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم برصغیر میں اتنے مستحکم ہو گئے کہ کوئی ساٹھ برس کے بعد وہ اس پورے ملک کو تاجِ برطانیہ کے ماتحت کروا گئی۔ ان غداروں کو موت آتی تھی نہ آتشِ دوزخ انہیں قبول کرتی تھی۔

اقبال فرماتے ہیں کہ برصغیر کی سیاسی غلامی کو ان غداروں کی ہوسناکی نے جنم دیا اور ایسے غداروں سے ہر کہیں اور ہر زمان میں برحذر رہنے کی ضرورت ہے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
می ندانی خطۂ ہندوستاں
آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں
در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت؟
ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت
ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصلِ او از عادتے یا جعفرے است
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

پھر سلطان شہید ٹیپوؒ کا دریائے کاویری کے نام پیغام ہے۔ اس پیغام کا ایک جزو یہ ہے کہ غلام موت سے ڈرتے ہیں۔ احرار اور آزاد افراد موت کو لبیک کہتے ہیں۔ مومن تو مرگِ بستر سے خرسند نہیں۔ اسے حیدری اور کراری سے لگاؤ ہے۔ وہ دفاع یا اصلاح کی خاطر جنگ و جہاد بھی کرتا ہے مگر اس کا جہاد غارت گری سے پاک اور منزہ ہوتا ہے۔ اس کا جہاد ناگزیر صورت میں ہجرت الی الحق ہے جسے ایک حدیث میں اسلام کی رہبانیت قرار دیا گیا ہے۔ حضرت علامہ کے یہ اشعار بالخصوص آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں ؎

ہر زماں میر و غلام از بیمِ مرگ
زندگی او را حرام از بیمِ مرگ

بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگِ او را میدہ.... جانے دگر
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضےٰ چیزے دگر
جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است
جنگِ مومن، سنّتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست
ترکِ عالم، اختیارِ کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقدام گفت
جنگ را رہبانیِ اسلام گفت

جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا، حریت سیاسی ہی نہیں فکری بھی اہم اور ضروری ہے۔ فکری آزادی کی اساس پاکیزگی اور عفتِ فکر پر ہونی چاہیے۔ تطہیرِ فکر کے بعد تعمیرِ فکر مشکل نہیں رہتی۔ جو تفکر پاکیزہ نہ ہو، وہ قلب میں سوز و حرارت پیدا نہیں کرتا ؎

زندگی از گرمیِ ذکر است و بس
حریت از عفتِ فکر است و بس
چون شود اندیشۂ قومے شراب
ناصرہ گردد بدستش سیم ناب
پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر[۱۲]

فکری آزادی بے پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ فکری ارتداد کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا دیکھنا چاہیے کہ آزادانہ گفتار کے پیچھے کوئی پختگی اور سلیقہ بھی ہے یا نہیں؟ آزادیِ فکر اگر کسی ضابطے کی پابند نہ ہو تو انسان حیوان کے مرتبۂ اسفل پر جا پہنچے گا۔ حیوانات بھانت بھانت کی آوازیں نکالتے ہیں مگر ان آوازوں میں کوئی ربط و ضبط بھی ہے؟ اقبال نے فرمایا ؎

جو دوئی فطرت سے نہیں لائقِ پرواز
اس مرغِ بے چارہ کا انجام ہے افتاد

ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا
ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیاد
اُس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد[۱۱۳]

اور ؎

آزادیِ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا طریقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ[۱۱۴]

مردِ حُر کے اوصاف

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کا ایک عنوان "مردِ حُر" ہے۔ یہ مردِ حُر ایک نصب العینی مردِ آزادہ ہے۔ وہ گویا اقبال کا تصوراتی مردِ مومن ہے۔ مردِ حُر سلطان و امیر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ سلاطین اس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ وہ عبدِ فرنگ نہیں، عبدہٗ ہے۔ وہ لا الہ الا اللّٰہ کا وارثِ حقیقی ہے۔ وہ تقدیر کا شاکی نہیں، خود تقدیر ساز ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مردِ حُر کی ہم نشینی غلاموں کے لیے اکسیر ہے۔ تاثیرِ صحبت سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں ؎

مردِ حُر محکم ز وردِ "لاتخف"
ما بمیداں سر بجیب، او سر بکف
مردِ حُر از لا الٰہ روشن ضمیر
می نگردد بندۂ سلطان و میر
ما ہمہ عبدِ فرنگ، او عبدہٗ
او نگنجد در جہانِ رنگ و بو

ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش
او ز دستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش
سینۂ این مرد می جوشد چو دیگ
پیشِ او کوہِ گراں یک تودہ ریگ

طعنہ و طنز کا نشتر

اقبال نے حریت کے لیے جدو جہد نہ کرنے والوں اور غلامی پر قانع افراد پر طعنہ و طنز کے نشتر چلائے اور اس طرح انہیں حصولِ آزادی کے لیے آمادہ تر کیا۔ یہاں اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کتاب "ضربِ کلیم" میں ایک قطعہ "شکر و شکایت" کے عنوان سے ہے۔ اس میں وہ شکرِ خدا ادا کرتے ہیں کہ انہیں روحانی اور فکری بلندی نصیب ہوئی۔ انہیں عالمگیر شہرت ملی اور انہیں مسلم نشاۃ ثانیہ کا نقیب بنایا گیا۔ اس کے باوجود وہ شاکی ہیں کہ وہ برصغیر ہند میں پیدا ہوئے جہاں کے لوگ غلامی قبول کیے ہوئے ہوں ؎

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہانخانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خرسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

"سلطانی" کے عنوان سے وہ مسلمانوں سے مخاطب ہیں کہ مومنانہ عشق و مستی اور فقر کی عدم نگاہبانی کی وجہ سے وہ فرنگ کی غلامی کے شکنجے میں جکڑ دیے گئے ہیں ؎

یہ جبر و قہر نہیں ہے، یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی!
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

ایک قطعے کا عنوان ہی "گلہ" ہے۔ اس میں برِصغیر کے غلاموں کی بدحالی کا بیان ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس بدحالی و غلامی کا گلہ مجھے اہلِ ہند سے ہے۔ یورپ سے کیا گلہ کریں، وہ تو من جملہ استعمارگراں ہے ہی۔ مگر اہلِ ہند سے گلہ شکوہ ہے کہ وہ غلامی پر رضامند نظر آتے ہیں ؎

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مُردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

اقبال کی ایک طنز اپنے حوالے سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ راز کہنا پڑ رہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے وقت مجھے ایک خاص وجہ سے ندامت ہوتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حریت و آزادی کا عالمی منشور دیا۔ ایسے پیغمبرؐ کی امت سے انتساب اور غلامی پر قناعت اجتماعِ ضدین ہے، اس لیے ایک حساس غلام کو درود خوانی پر ندامت و خجالت ہونا ناگزیر ہے۔ اس طرح اس کا انتساب بہ رسولؐ گویا پیغامِ آخرالزماںؐ کو خراب کرنا ہے ؎

گرچہ دانا حالِ دل با کس نگفت
از تو دردِ خویش نتوانم نہفت
تا غلامم در غلامی زادہ ام
ز آستانِ کعبہ دور افتادہ ام
چوں بنامِ مصطفیٰؐ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ "اے محکومِ غیر!
سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او ﷺ

یہاں ضمناً یہ نکتہ بیان کر دیا جائے کہ اقبال ایک عظیم عاشقِ رسولؐ ہونے کے علاوہ کثرت سے درود خواں بھی تھے۔ چنانچہ کبھی کبھی اپنے کلام کی حسنِ تاثیر کے بارے میں فرماتے تھے کہ اس کا باعث درود خوانی ہو سکتا ہے۔ نظم "مسجدِ قرطبہ" میں وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر فرماتے ہیں ؎

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اقبال اس بات کے آرزو مند تھے کہ مسلمانوں کے طرزِ عمل سے لوگ اسلام کے بارے میں مثبت نقطۂ نظر اختیار کریں۔ موجودہ عصر کے مسلمان، الّا ماشاء اللہ، اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کو تنفر دیتے ہیں۔ "جوابِ شکوہ" کے ایک بند میں ہے ؎

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں
اُمتی باعثِ رسوائیِ پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیمؑ پدر اور پسر آذر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خُم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے، تُم بھی نئے

جامع بیان والی ایک نظم

ارمغانِ حجاز علامہ اقبال کا آخری مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات کے چند ماہ بعد شائع ہوا۔ اس کے اردو حصے میں "غلامی و آزادی" کے ضمن میں قابلِ توجہ نکتے ملتے ہیں۔ ایک نظم میں 'عالمِ برزخ، قبر، مُردے' صدائے غیب اور زمین' محوِ کلام دکھائی دیتے ہیں۔ رستاخیز کے لیے "صدائے غیب" آتی ہے کہ بقائے دوام صرف آزاد افراد کی خاطر ہے۔ اس پر محکوم افراد کی قبور اپنے مُردوں کو کوستی ہیں کہ انہوں نے آزادی کیلیے جدوجہد کیوں نہ کی تھی:

○

صدائے غیب

نے نصیبِ مار و کژدم، نے نصیبِ دام و دد
ہے فقط محکوم قوموں کے لیے مرگِ ابد
بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

قبر

(اپنے مُردہ سے)

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا!
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوز ناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر محکوم کی میت سے سو بار الحذر
اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

ایک دوسری نظم "دوزخی کی مناجات" ہے۔ یہ دوزخ نشیں شخص عالمِ انسانی کے سارے مقام یاد کرتا اور ان کی مذمت کرتا ہے کہ وہ بھی دوزخ ہی تھے۔ دوزخ میں عتاب و عذاب سے صرف نظر وہ شکر کرتا ہے کہ یہاں تو سوداگرِ یورپ یعنی انگریز کی غلامی سے اسے رہائی ملی ہوئی ہے ؎

اللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پُرسوز
سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

اس حصے کی ایک طویل نظم "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" ہے۔ نام فرضی ہے۔ اس نظم کے ۱۹ حصے ہیں۔ کوئی نصف صدی پہلے بھی کشمیری آزادی و حریت کے لیے سرگرم تھے۔ علامہ اقبال نے اس وقت انہیں درسِ حریت دیا اور غلام ساز قوتوں کے ہتھکنڈوں سے آگاہ کیا۔ اس نظم کے مطالب، اقبال کے اکثر کلام کی طرح ہنگامی اور عصری نوعیت کے نہیں۔ ان کی شان ابدی ہے کہ گویا ابھی کہے جا رہے ہیں۔

ایک نظم وہ کہتے ہیں کہ حاکم، فریب کارانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے، غلامی کی زنجیریں محکم کیے رکھتے ہیں۔ وہ غلاموں کو حقوق و مراعات کے سبز باغ تو دکھاتے ہیں مگر عملاً انہیں دبائے رکھتے ہیں۔ ایسے حالات میں محکوموں کا جذبۂ خودی ہی کام کر سکتا ہے ؎

موت ہے اک سخت تر جس کا غلامی ہے نام
مکر و فنِ خواجگی، کاش سمجھتا غلام!
شرعِ ملوکانہ میں جدت و احکام دیکھ
صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام
اے کہ غلامی سے ہے روح تیری مضمحل
سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

یہ اس نظم کا دوسرا جزو تھا۔ ایک دوسرے حصے میں وہ فرماتے ہیں کہ عبد و حر کے رجحان اور ذوق میں تفاوت کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ عالمِ تصوف کے مباحث احرار کے لیے بیدار ساز ہیں اور غلاموں کے لیے پیغامِ موت ؎

خود گیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق
آزاد ہو سالک تو یہ ہیں اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا "ہمہ اوست"
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

اس نظم کا چوتھا اور پانچواں حصہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ حریت خواہیِ کشمیریاں کے موجودہ تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ان حصوں کو بلا تبصرہ نقل کیے دیتے ہیں ؎

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو و رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رُو

٭

درّاج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں
حیرت میں ہے صیاد، یہ شاہیں ہے کہ درّاج
ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم
مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

غلامی و آزادی کا موازنہ

اقبال نے آزاد اور غلام افراد کے رجحانات اور ان کی معنوی توانائیوں کے فرق پر بہت لکھا ہے۔ اس قسم کا ایک موازنہ ان کی فارسی مثنوی اسرارِ خودی میں بھی ملتا ہے۔ علامہ مرحوم نے حضرت امام شافعیؒ کے مقولے ․ ․ ․ ․ ․ "الوقت سیف" کے عنوان کے تحت مسئلہ زمان سے بحث کی۔ انہوں نے ایک نکتہ یہ بتایا کہ آزاد افراد، زمان پر حاوی ہوتے ہیں۔ وہ اندک زمان میں غیر معمولی کارنامے انجام دیتے ہیں۔ ان کی تدبیریں ہی ان کی تقدیریں بن جاتی ہے مگر غلام افراد کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ان کے کاموں میں ندرت و جدت نہیں ملتی۔ وہ تقدیر کے شاکی رہتے ہیں۔ وہ زمان پہ غالب نہیں۔ زمان ان پر چھایا رہتا ہے۔ زندگی اور زمان ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ عبد کا زندگی کے بارے میں رویہ خوش آیند نہیں جبکہ حر حال میں خرم و خرسند رہتا ہے ؎

عبد گردد یاوہ در لیل و نہار
در دلِ حُر یاوہ گردد روزگار
عبد از ایام می بافد کفن
روز و شب را می تند بر خویشتن
مردِ حُر خود را ز گِل بر می کند
خویش را بر روزگاران می تند

عبد را ایام زنجیر است و بس
بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس
ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر
حادثات از دستِ او صورت پذیر

یہ مضامین اقبال کے اردو کلام میں بھی وارد ہوئے ہیں۔ کہیں ان کا تناظر حریت و غلامی ہے اور کہیں ایمان و کفر۔ جیسے ؎

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تو ڈھونڈ رہا ہے سمِ افرنگ کا تریاق
اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند
برّندہ و صیقل زدہ و روشن و برّاق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

٭

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

بہرحال اقبال احرار کے جن اوصاف کے قائل ہیں، غلام ان سے بہرہ مند نہیں رہتے ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

مثنوی 'بندگی نامہ' کا پہلے ذکر ہوا۔ اس مثنوی میں غلامی اور غلاموں کی سخت ترین الفاظ میں مذمت ہے۔ مگر اس مذمت کا مدعا، غلاموں کو آزادی کے لیے آمادۂ پیکار کرنا ہے۔ اس سے ان کی حوصلہ شکنی مقصود نہیں ہے ؎

از غلامی دل بمیرد در بدن
از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی ضعفِ پیری در شباب
از غلامی شیرِ غاب افگندہ ناب
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد
این و آن با این و آن اندر نبرد
آن یکے اندر سجود این در قیام
کارد بارش چوں صلوٰۃِ بے امام
آبروئے زندگی در باختہ
چوں خزاں با کاہ وجُو درساختہ
در غلامی تن ز جاں گردد تہی
از تنِ بے جاں چہ امیدِ بہی
ذوق ایجاد و نمود از دل رود
آدمی از خویشتن غافل رود
جبرئیلے را اگر سازی غلام
بر فشند از گنبدِ آئینہ فام
کیش او تقلید کاوش آذری است
ندرت اندر مذہبِ او کافری است
تازگیہا دہم و شک افزایدش
کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش
چشمِ او بر رفتہ ، از آیندہ کور
چوں مجاور رزقِ او از خاکِ گور

ترجمہ:

غلامی سے جسم میں دل مردہ ہوجاتا ہے ۔غلامی سے روح جسم کا بوجھ بن جاتی ہے ۔

غلامی سے جوانی میں بڑھاپے کی کمزوری آجاتی ہے۔ غلامی سے غار کا شیر اپنے خالص (دانت) گرا دیتا ہے۔
غلامی سے ملت کی بزم منتشر ہو جاتی ہے۔ یہ اُس سے اور وہ اس سے پیکار میں ہوتا ہے۔
یہ سجدے میں ہوتا ہے اور وہ قیام میں۔ اس (غلام قوم) کا نظام بے امام نماز کا سا ہوتا ہے۔
غلام قوم زندگی کی آبرو و غیرت برباد کر دیتی ہے۔ وہ گدھوں کی طرح گھاس اور جَو (کھانے پینے) پر خورسند رہتی ہے۔
غلامی میں جسم، روح سے خالی ہوتا ہے۔ بے روح جسم سے بہتری کی کیا توقع ہے؟
ایجاد اور خود نمائی کا ذوق دل سے جاتا رہتا ہے۔ انسان خود سے غافل ہو جاتا ہے۔
تو اگر کسی جبرئیل کو بھی غلام بنا دے تو وہ اپنے بُراق گنبد سے گر پڑے گا۔
ایسے غلام کا شیوہ تقلید اور بت گری ہے۔ اس کے مذہب میں جدّت کفر ہے۔
اس کی جدّتیں وہم اور شک میں اضافہ کرتی ہیں۔ اسے پرانی اور فرسودہ چیزیں ہی اچھی لگتی ہیں۔
اس کی نظر ماضی پہ ہے۔ مستقبل سے وہ اندھا ہے۔ مزار کے مجاور کی طرح اس کی روزی قبر کی مٹی سے ہے۔

٭

یہاں تک کی ہماری سطور سے واضح ہے کہ اقبال نے بھرپور انداز میں آزادی و حریت کی مدحت اور غلامی کی مذمت کی۔ یہ مدحت و مذمت کہیں بیانیہ انداز میں ملتی ہے اور کہیں طنز و تشنیع یا موازنے کی صورت میں۔ مقصود ہر کہیں یہی تھا کہ یہ مردِ حق، استعمار گردی کے دام کے تار و پود بکھیرتا رہے اور اس کے جانفزا نغموں سے کمزور، قوی بننے کی آرزو کریں، ممولے، بلبلیں اور چڑیاں، عقابوں اور شاہینوں کا مقابلہ کریں یعنی غلام، غلام سازوں سے نبرد آزمائی کریں۔ اقبال کا تصور یہاں بڑا مہتم بالشان ہے مگر حکیم الامّتی کا تقاضا تھا کہ اقبال اسے وحشت ناک فوق الطاقت نہ بناتے ؎

نوا پیرا ہو اے بلبل! کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

گرما دو غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

بجلال تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز این دعا کہ بخشش بکبوتراں عقابی

کبوتر بچۂ خود را چہ خوش گفت
کہ نتواں زیست باخوئے حریری
اگر 'یاھو' زنی از مستیِ شوق
گلہ را از سرِ شاہیں بگیری

تصورِ شاہین

دنیا کے کئی شعرا نے شاہین یا اس کے قبیل کے قوی پرندوں کے ذکر سے اپنی زبان و بیان کو مزیّن کیا مگر علامہ اقبال کا گلبانگِ شاہین کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ان کے مقابلے میں بڑھا ہوا اور زیادہ شکوہ مند ہے۔ اقبال نے ایک استفسار کے جواب میں لکھا ہے کہ :

"شاہین میں اسلامی فقر و درویشی کی اعلیٰ صفات پائی جاتی ہیں جیسے وہ گھر بنانے سے بے تعلق ہے۔ بلند پرواز اور بلند نگاہ ہے۔ نہایت بلندی پر رہتا ہے۔ مردار خور نہیں ہے بلکہ خود شکار کر کے کھاتا ہے، البتہ کمزور پرندوں کے خون سے اس کے پنجے بھی رنگین ہوتے ہیں۔ اس کے پنجوں سے کوئی صید نکل نہیں سکتا۔"

شوقِ شکار میں شاہین کبھی کبھی انسانوں کے بچوں کو بھی اچک لیتا ہے[۱۸]۔ اقبال، شاہین کی اس "محکم گیری" سے بے خبر نہ تھے۔

ترا ناداں امید غم گسار یہا ز افرنگ است؟
دلِ شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

صیدِ مومن این جہانِ آب و گل
باز را گوئی کہ صیدِ خود بہل؟
حل نشد این معنیِ مشکل مرا
شاہیں از افلاک بگریزد چرا
وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد
مرتکے از چنگِ او نامد بدرد
در کنامے ماند زار و سرنگوں
پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں

بہرطور شاہین کی اعلیٰ صفات کئی ہیں جن کی وجہ سے یہ پرندہ اقبال کا ہی نہیں، اقبال خوانوں کا بھی محبوب و مرغوب بن گیا ہے۔ اس کی جرأت و بے باکی، چستی، تہاجم، سیرچشمی اور مستغنی مزاجی اب ایک متداول بات ہے۔ کلامِ اقبال میں حیوانات اور پرندوں کا بڑا متنوع اور قابلِ توجہ ذکر ہے۔ یہ شاعر کے مطالعے اور مشاہدے کا غماز ہے۔ شاہین کے کئی دوسرے مترادفات اقبال کے ہاں ملتے ہیں جیسے باز، شاہباز، عقاب اور جرّہ شاہین۔

اقبال کے ہاں شاہین بطور ایک علامت اور کردار بظاہر ۱۹۲۲ء سے مستعمل ہوا۔ اس سے قبل ۱۹۱۹ء میں وہ حافظ کے ایک شعر کی صورت میں تضمین ہوا اور وجہِ تضمین، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر[۱۹] کی ذات تھی ؎

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

نظم "طلوعِ اسلام" ۱۹۲۳ء میں لکھی گئی۔ اس میں شاہین کا مومنانہ ذکر ہے ؎

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک؟
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی!

۱۹۲۳ء میں "پیامِ مشرق" شائع ہوئی۔ اس میں شاہین کا متنوع ذکر ہے۔ ایک نظم میں باز یعنی شاہین اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں شاہین کے جملہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ نیز اس میں "کافوری" شاہینوں کا بیان ہے۔ اقبال نے لفظ "کافوری" پر حاشیہ لکھا ہے کہ:

"باز کی قسم کا ایک سفید رنگ شکاری پرندہ جو ترکستان کے پہاڑوں اور

صحراؤں میں پایا جاتا ہے"۔

اس پرندے کی خاطر امرا و سلاطین بھی ترستے رہے ہیں ؎

نقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبالؔ آگیا کیونکر
میسّر میر و سلطاں کو نہیں شاہینِ کافوری

اس نظم میں شاہین اپنے بچے کو بتاتا ہے کہ باز و شاہین دیکھنے میں مشتِ پر ہیں مگر وہ شیر دل ہیں۔ شاہین کو ادنیٰ پرندوں کی صحبت اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرے پرندے صید ہیں اور شاہین صیاد۔ پست فطرت پرندوں کی دوستی شاہین کو اپنی صفات سے غافل کر دے گی ؎

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبتِ زاغ

شاہین کہتا ہے کہ کتنے باشے اور شکرے غلط صحبت کی وجہ سے اپنا شکاری خانوادہ بھول بیٹھے۔ باز یا عقاب کا ایک دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ کوہ یا دشت میں آشیانہ اختیار کرتے ہیں اور دوسرے کی کمائی نہیں کھاتے بلکہ خود شکار کرتے ہیں۔

ایک نظم "شاہین و ماہی" ہے۔ اس نظم میں ایک بچۂ ماہی وسعتِ بحر کی بات کرتا ہے۔ بچۂ شاہین کہتا ہے کہ مجھے وسعتِ بحر سے کیا تعلق ہے میں وسعتِ افلاک سے مربوط ہوں ؎

زد بانگ کہ شاہینم و کارم بہ زمیں چیست؟
صحراست کہ دریاست تہِ بال و پرِ ماست

یہ آخری مصرعہ ہماری فضائیہ کا شعار ہے۔

شاہین کے ذوقِ پرواز، اس کی تازہ رزق حاصل کرنے کی سعی اور اس کے تند و تیز جست و خیز کرنے سے علامہ اقبالؒ نے تازہ بتازہ معانی پیدا کیے ہیں۔ وہ کبوتر یا کرگس وغیرہ کے تقابل میں باز و شاہین کی بلندیٔ شان بتاتے ہیں۔ جیسے ؎

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

٭

رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور
رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و ہور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ایک قطعے میں بوڑھا شاہین اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ سخت کوش بنے اور کبوتر کی قسم کے پرندوں پر اپنی یورش جاری رکھے ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر!
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ایک دوسرے قطعے کا عنوان ہی "شاہین" ہے۔ اس میں یہ درویش پرندہ اپنے اوصاف و خصائل بیان کرتا ہے۔ جیسے ؎

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جوانمرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوگا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

شاہین کے مجموعی اوصاف اقبال کے ہاں ایک مسلمان و مومن کے اوصاف کے مترادف بن گئے ــــ کلامِ اقبال کا شاہین، چند جزوی استثنائی صورتوں کے علاوہ ایک مثالی مسلمان ہے جسے مردِ حُر، مردِ غیور اور مردِ مجاہد وغیرہ سے موسوم کیا جاتا ہے گا۔ علامہ مرحوم مسلم نوجوان کو "شاہین زادہ" یا شاہین بچہ قرار دیتے ہیں وہ بجا طور پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے رسمِ شاہینی اور طریقِ شاہبازی کو عام کیا ؎

تنش از سایۂ بالِ تذروی لرزہ می گیرد
چو شاہیں بچۂ اندر قفس با دانہ می سازد

اگر یک قطرۂ خوں داری، اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

بہت مدت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا

اس حوالے سے وہ اپنی ملت کے شاہینوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اچھا ماحول اختیار کریں، تن آسانی سے احتراز کریں اور اپنی نسبتِ محمدی کو نہ بھولیں ۔

تو اے شاہیں نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم
ہوائے او ببالِ تو دھد پروازِ کوتاہے

میامیز با کبک و تورنگ و سار
مگر ایں کہ داری ہوائے شکار
تنِ نرم و نازک بہ تیہو گداز
رگِ سخت چوں شاخِ آہو بیار

نصیبِ جہاں آنچہ از خرمی است
ز سنگینی و محنت و پُردلی است

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تُو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو

وہ دعا کرتے ہیں کہ خدا، شاہیں بچوں کو ان کی بصیرت سے بہرہ ور کر دے ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے[42]

اقبال نے شیوۂ شاہینی کی حامل مسعود سعد سلمان لاہوری (۵۱۵ھ) کی ایک رباعی کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ مسعود نے شاہین کی جرأت و ہمت اختیار کرنے کی تلقین کی تھی اور بلبل و طاؤس کی نوا اور رنگ سے برحذر رہنے کا مشورہ دیا لیکن حضرتِ علامہ نے مضمون کو بغایت بلند کر دیا ہے ؎

مسعود سعد:

با ہمت باز باش و با کبرِ پلنگ
زیبا بگہِ شکار و پیروز بجنگ
کم کن بر بلبل و طاؤس درنگ
کانجا ہمہ آواز آمد و اینجا ہمہ رنگ[43]

اقبال:

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لیے تنگ
چیتے کا جگر چاہیے، شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیِ دانشِ فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ[44]

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

"بے روشنیٔ فرہنگ" بہرحال ہر کوئی محترم و معزز زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ علامہ ممدوح اسی لیے اساتذہ سے شاکی تھے کہ وہ شاہیں بچوں کو مناسب تعلیم و تربیت نہیں دے رہے ۔

شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا[۲۵]

قبائے زندگانی چاک تا کے
چو موراں آشیاں در خاک تا کے
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز
تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے

ندای از مقامِ کبریائی
حضورِ دوں نہاداں جبہہ سائی
تو شاہینی ولیکن خویشتن را
نگیری تا بدامِ خود نیائی

اس گفتار کو زبورِ عجم کی دعا کے چند اشعار پر ختم کر دیا جائے ۔

یا رب! درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ
سیلم مرا بجوئے تنک مایہ مپیچ
جولانگے بوادی و کوہ و کمر بدہ
شاہینِ من بصید پلنگاں گذاشتی
ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار
تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ

حواشی

۱۔ بانگِ درا، کلیاتِ اردو : شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۳ء اور بعد : ص ۳۸

۲۔ اقبال ریویو : اقبال اکادمی لاہور - اپریل ۱۹۸۴ء

۳۔ جاوید نامہ : کلیاتِ فارسی : شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۳ء اور بعد : ص ۷۸۸

۴۔ *Speeches, Writings and statements of Iqbal*

مرتبہ : لطیف احمد شروانی : اقبال اکادمی لاہور - طبع ۱۹۷۷ء

۵۔ ارمغانِ حجاز : کلیاتِ اردو : ص ۶۸۲ - ۶۸۳

۶-۷-۸۔ قرآن مجید بالترتیب ۱۳ : ۴۹ ، ۱۰ : ۴۹ ، ۱۷۲ : ۷

۹۔ پیامِ مشرق : کلیاتِ فارسی : ص ۳۰۴

۱۰۔ دیکھیں میرا مقالہ "تقاریرِ بیادِ اقبال"۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ۱۹۸۶ء۔ صفحہ ۱۱۴ تا ۱۳۰

۱۱۔ ضربِ کلیم : "قطعہ امید" : کلیاتِ اردو : ص ۵۷۲

۱۲۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" کلیاتِ فارسی : ص ۸۰۷

۱۳۔ بالِ جبریل : کلیاتِ اردو - ص ۴۶۰

۱۴۔ ضربِ کلیم : ایضاً - ص ۵۳۷ - ۵۳۸

۱۵۔ پس چہ باید کرد : کلیاتِ فارسی - ص ۸۳۳

۱۶۔ ضربِ کلیم : کلیاتِ اردو - ص ۴۳ - ۴۴

۱۷۔ ارمغانِ حجاز : کلیاتِ اردو - ایضاً ص ۶۷۴

۱۸۔ مثلاً ۹ - نومبر ۱۹۹۰ء کے اخبارات میں ایک خبر اس طرح شائع ہوئی ہے :

شاہین نے ۲ سالہ بچے کو پنجوں میں دبوچ کر لے گیا

تہران (۸ - اپریل) سہنوا - اصفہان کے قریب ایک شاہین دو سالہ بچے کو اس وقت پنجوں میں دبوچ کر اڑ گیا - جب بچے کے ماں باپ اور بہن بھائی پکنک منانے میں مصروف تھے - یہ بات

شام کے اخبار "کیہان" نے بتائی ہے۔

اخبار کے مطابق شاہین جو بہت بلندی پر فضا میں محوِ پرواز تھا، اچانک نیچے آیا اور پلک جھپکتے ہی بچے کو پنجوں میں دبوچ کر فضا میں غائب ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد فوری طور پر امدادی جماعتیں طلب کر لی گئیں۔ زبردست جدوجہد کے باوجود تلاش کرنے والوں کو شاہین کا آشیانہ ملا ہے اور نہ ہی بچے کے بارے میں کچھ علم ہو سکا ہے۔

(نوائے وقت: راولپنڈی)

۱۹۔ نظم "اسیری" (بانگِ درا حصہ سوم) ۱۹۱۹ء میں مولانا جوہر کی قید سے رہائی کے موقع پر اقبال نے لکھی اور امرتسر میں پڑھی تھی۔

۲۰۔ بالِ جبریل: کلیاتِ اردو: ص ۳۵۲

۲۱۔ ایضاً: ص ۴۰۸

۲۲۔ ایضاً: ۳۷۸

۲۳۔ دیکھیں میری کتاب "اقبال اور فارسی شعرا": شائع کردہ اقبال اکادمی لاہور: ۱۹۷۷ء: ص ۶۲-۶۳

۲۴۔ بالِ جبریل: کلیاتِ اردو: ص ۳۶۸

۲۵۔ ایضاً: ص ۳۲۴

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006
اقبال سائبر لائبریری

AL-TAWḤĪD

A Quarterly Journal of Islamic Thought and Culture

A quarterly journal published by Sāzmān-e Tablīghāt-e Islāmī, Tehran, Islamic Republic of Iran. Contains articles on Qur'ānic studies, ḥadīth (tradition), Islamic philosophy and 'irfān (mysticism), fiqh and uṣūl (law and jurisprudence), Islamic history, economics, sociology, political science, comparative religion, etc., and reviews on books on related topics. Launched in 1983, the journal is in the third year of publication.

Scholars from all over the world are invited to contribute to the journal.

All contributions and editorial correspondence should be sent to:

The Editor, Al-Tawḥīd (English), P. O.Box 14155-4843, Tehran, Islamic Republic of Iran.

Distributed by:

Orient Distribution Services
P.O.Box 719, London SE26 6PS, England

Subscription Rates (inclusive of postage):

	Per copy	Annual Subscription
Institutions & Libraries	£ 3. 75	£ 15.00
Individuals	£ 2. 50	£ 10.00
Back copies	£ 4. 00	